© rasailojaraid.com

پروفیسر عابد صدیق

اسلامی ثقافت، اردو شاعری اور اقبال

ثقافت کا لغوی مطلب زیرکی اور دانائی میں غالب ہونا ہے۔ ایک دوسرا مطلب نیزوں کو سیدھا اور درست کرنا اور ہتھیاروں سے کھیلنا ہے۔ تیسرا مطلب کامیاب و فتح مند ہونا ہے۔ لیکن اب ثقافت کا لفظ جن وسیع معانی میں استعمال ہوتا ہے ان میں اگرچہ اُن بنیادی مطالب یعنی عقل و دانائی میں بالادستی، حربی فنون میں برتری اور مجموعی طور پر کامیابی و کامرانی سب کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ تاہم اب اس کے معانی کی وسعت تمام شعبہ ہائے زندگی میں کسی قوم کے تفوق اور برتری کے نقوش کو محیط ہے۔ اور اس میں طرزِ بودوباش، وضع و لباس، رسم و رواج، قومی دلچسپیاں اور ان کے مظاہر، سماجی و عقلی علوم میں کسی قوم کا منفرد زاویہَ نظر اور زندگی میں اس کے نفوذ و ظہور کی عملی شکلیں، فنونِ لطیفہ میں قومی مزاج اور فکر و عمل کی نمود اور زندگی کی ہر سطح پر نمودار ہونے والے وہ آثار جو کسی قوم کے تشخص اور انفرادیت کی کامیابی سے نشان دہی کرتے ہوں۔ سب ثقافت کی ذیل میں آتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی ثقافت سے مسلم معاشرے میں تہذیب و تمدن کے وہ تمام آثار و نقوش مراد ہوں گے جو ہر شعبہَ زندگی میں اور ہر سطح پر اس طرح نمودار ہوں کہ ان کا وجود اسلامی نظریہَ حیات کی برتری، تفوق، فتح مندی اور کامیابی کی دلیل ہو۔ ایک بات کی وضاحت یہاں بہت ضروری ہے کہ ثقافت کے مفہوم میں تفوق، برتری، غلبہ اور فتح مندی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ مسلمانوں پر مشتمل کسی آبادی میں اگر اسلام کی بجائے کسی اور مذہب اور نظریہَ حیات کو ان کی عملی زندگی میں برتری حاصل ہو گی تو ہم اس آبادی یا سوسائٹی کے رسم و رواج اور رہن سہن کو اسلامی ثقافت کا مظہر ہرگز نہیں کہہ سکیں گے۔ خواہ وہ لوگ خود کو اسلام کے کتنے بڑے اور سچے مدعی کیوں نہ سمجھتے ہوں۔

اب شاعری کی طرف آئیے، شاعری الفاظ کے ذریعے احساسات کی حسین ترجمانی کا نام ہے۔ گویا شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں ذریعہَ اظہار..... لفظ ہو گا۔ نفسِ اظہار (یا اسلوب)...... حسین ہو گا اور ظہور احساسات کا ہو گا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ احساس تجربے اور خیال دونوں کو محیط ہے۔

جب ہم فن شاعری اور ثقافت کے رشتوں پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ذریعہَ اظہار..... یعنی الفاظ اور نفسِ اظہار یعنی اسلوب سے ثقافت کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں فنِ شاعری کے مخصوص لوازم ہیں۔ البتہ ظہور کا تعلق واضح طور پر ثقافت سے ہے۔ یعنی وہ احساسات جن کی ترجمانی شاعری کا منصب ہے۔ شاعری کو ثقافت سے وابستہ کرتے ہیں۔ ذریعہ اور اسلوب نہیں۔

لیکن ابھی ایک سوال باقی ہے کہ فن شاعری میں کسی ثقافت کے ظہور اور نمود کی شکل کیا ہوتی ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سوال کا جواب دینا اس لئے ضروری ہے کہ جب ہم کسی ثقافت کو کسی مذہب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت جلد ایک مغالطے کا شکار ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس مذہب کے عقائد کی تشریح و توضیح یا تبلیغ کے مقاصد کے لئے لکھی جانے والی تحریریں اس ثقافت کا مظہر ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مذہب کے اثرات ثقافت پر بہت گہرے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اثر ایک ہی دن میں نہیں پڑ جاتا۔ بلکہ اس میں ایک تدریج کارفرما ہوتی ہے۔ عقائد، اعمال کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اور جب وہ اعمال کسی مذہب کے ماننے والوں کا وظیفۂ زندگی بن جائیں اور معاشرتی حقائق کی صورت میں زندگی کی ہر سطح پر جلوہ نما ہوجائیں تو وہ ثقافت پیدا ہوگی جس کی بنیاد مذہب فراہم کرتا ہے۔

اس کی وضاحت کیلئے صرف ایک مثال کافی ہے، ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ آخرت پر ایمان لانا ہے۔ آخرت پر ایمان کے اس عقیدے سے ان کی زندگیوں میں یہ اثر ہوا کہ ان کے مزاج میں دنیا اور اس کے مافیہ کی طرف بے توجہی اور بے رغبتی پیدا ہوگئی۔ جس سے ایک طرف یہود و ہنود کی طرح حریصانہ مال اندوزی، مسلمانوں کا قومی کردار نہ بن سکی۔ دوسری طرف فیاضی اور داد و دہش کے جو ان گنت واقعات مسلمانوں کی تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں وہ بھی اسی سبب سے ہیں۔ گویا اس عقیدے کی وجہ سے حرص و بخل سے گریز اور فیاضی مسلمانوں کا قومی یا ملّی کردار بن گئی۔ اس معاشرتی طرزِ احساس کی عکاسی اور ترجمانی تو ادب کا منصب ہے لیکن عقیدہ آخرت کی براہ راست تفسیر و توضیح پر مشتمل تحریروں کو ادب یا شاعری سے متعلق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ گویا یہ بات واضح ہوگئی کہ مذہبی معتقدات کے اثرات سے عملی زندگی میں پیدا ہونے والے طرزِ احساس کا اظہار تو شاعری میں ثقافت کی نمائندگی کرے گا لیکن خود ان معتقدات کی تشریح شاعری کا منصب نہیں ہوگی۔

وہ سوال ابھی باقی ہے کہ اگر عقائد کی تشریح شاعری کا منصب یا موضوع نہیں ہوگی تو پھر ادب میں ثقافت کے ظہور اور نمود کی شکل کیا ہوگی؟ اس کے جواب کے لئے جب ہم مختلف قوموں اور زبانوں کے ادبِ عالیہ پر استقرائی طریق سے تخریجِ اصول کی غرض سے نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور کا ادب فن میں، مبادیات میں، تعبیر و تمثیل استعارہ اور کنایہ وغیرہ کے استعمال کے سلسلہ میں ایک ایسے تمثال خانے کا حامل ہے جو متعلقہ قوم کے شاندار ماضی میں بکھرے ہوئے ان کے تہذیبی نقوش سے ترتیب پاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس شاندار ماضی کی تعریفیت مشتبہ ہوتی ہے تو نیم تاریخی، اساطیری اور دیومالائی حوالوں پر تکیہ کرلیا جاتا ہے۔ تصوراتی پیکروں کے ان نگار خانوں سے استعارے لانے کی وجہ سے جہاں ادب کو ایک شاندار تہذیب کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے وہاں یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ ادب کسی ایک زمانے سے مخصوص نہیں رہتا۔ بلکہ اس میں بے پناہ زمانی وسعت پیدا ہوجانے کے سبب وہ ایسی صداقتوں کا امین ہوجاتا ہے جو انسانی عقل و دانش اور تجربہ و واردات کے تسلسل سے صدیوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ کلاسیکی ادب کی عظمت میں منجملہ دیگر امور کے یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ ادب میں کسی ثقافت کی نمائندگی کا سراغ لگانے کیلئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے تصوراتی پیکروں کے نگارخانے یا استعارات و علامات کے تمثال خانے میں اس ثقافت کے نقوش کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اگر کسی تہذیب و تمدن کی عظمت و شوکت کے آثار و نقوش، ادب میں استعمال ہونے والے علائم و استعارات کے سرچشمے کی آبیاری کرتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ادب اس ثقافت کا آئینہ دار اور مظہر ہے۔

ان ضروری مباحث کے بعد جب ہم اس غرض سے اردو زبان کے شعری سرمائے پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان احساسات کی ترجمانی جو اسلامی معاشرے کے تہذیبی خدوخال کی نمائندگی کرتے ہوں اردو شاعری میں بہت کمیاب ہے۔ اسلامی تہذیب اور اس سے وابستہ احساسات کی ترجمانی اردو شاعری میں ایک عرصے تک نہ ہونے کے برابر رہی۔ باوجودیکہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر اردو زبان کے تمام بڑے شاعر مسلمان ہی تھے۔ اس افسوس ناک صورتحال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری فارسی شاعری کے زیرِ اثر پروان چڑھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عجمی تہذیب کے نقوش استعاروں کی شکل میں اردو شاعری کا ورثہ قرار پائے اور روایت کا حصہ بن گئے۔ چنانچہ تمام اصنافِ شاعری میں مجموعی فضا اور غالب رجحانات کے حوالے سے جب ہم اس نقطۂ نظر سے شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ (مثلاً) غزل میں رقیب کا تصور اور زنِ بازاری کا محبوب ہوجانا غیرت کی پامالی اور عفت و حیا کے جس فقدان کا مظہر ہیں اسلامی تہذیب ان کے وجود کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ خواتین کی زیب و زینت کی ہر ہر تفصیل کے ذکر سے لذت کوشی و ہوسناکی کو سرمایۂ فر اور زہد و پاکبازی کو محلِ تہمت سمجھنا کسی عام شریفانہ ضابطۂ حیات میں بھی مستحسن نہیں۔ چہ جائیکہ اسلامی ثقافت سے اس کا کوئی تعلق ہوتا۔

عشقیہ مثنویوں میں اگرچہ زنِ بازاری کا ذکر کم اور بقول حکیم مومن خان مومن "عشقِ پردہ نشیں" کا ذکر زیادہ ہے۔ لیکن ملاقات کی گھاتوں، قرب و وصال کی تفاصیل، اور عمومی معاشرتی فضا کی وجہ سے یہ مثنویاں بھی ہمارے مقصد کے لئے مفید نہیں۔ امرد پرستی کے عام رجحان اور اس وقت کے مخصوص موضوعات کے علاوہ جنسی لذتیت اور اخلاقی پستی و بے راہ روی کی بدترین مثال اردو شاعری کا حصہ ہے۔ جسے ہم ریختی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس معاملے میں فارسی شاعری بھی اردو کا مقابلہ نہ کرسکی۔ جس کی گود میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ گویا......... پدر نتواں کردو پسر شں تمام کرد! دنیا کی کسی زبان کے ادب میں یہ "معاشرتی قدر" اس طرح نمایاں نہیں ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان معاشرتی اقدار اور اسلامی ثقافت میں بُعد المشرقین ہے۔

اردو شاعری کے ان موضوعات، رجحانات اور عمومی فضا کے اس جائزے میں ہم نے اب تک کئی اصناف اور ادیبوں کا ذکر نہیں کیا۔ مثلاً اخلاقی و متصوفانہ شاعری، مذہبی و نعتیہ شاعری وغیرہ۔ صوفیانہ شاعری کے بڑے حصے کا عالم یہ ہے کہ عجمی تصوف کی لہر اور ہندوستان کی بھگتی تحریک کے پیوند کے زیرِ اثر کچھ ایسی اخلاقی قدروں کا ذکر موجود ہے جس سے معاملات کی سطح پر ایک ایسی رواداری کا درس ملتا ہے جو بے حمیتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مترادف ہے۔ اور تجربے کے بعد اس کا مرکزی نقطہ یہ نظر آتا ہے کہ اپنے انفرادی اور قومی تشخص اور ملی وجود کے احساس کو ترک کر دینے کا نام خوش اخلاقی ہے۔ جو پر امن بقاءِ باہمی اور وسیع تر انسانی برادری کے تصور کے لئے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ احساسات و افکار کی سطح پر اردو شاعری کا یہ سارا مافیہ بھی اسلامی ثقافت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔

یہاں تک کہ مذہبی شاعری یعنی مرثیہ نگاری اور نعتیہ شاعری کے بیشتر سرمائے میں بھی ہمیں صرف تحریف شدہ اور مخلوط عقائد سے پیدا ہونے والے معاشرتی طرزِ احساس کی ترجمانی تو مل جاتی ہے۔ لیکن اسلام ایک فعال تمدنی حقیقت ہونے کی حیثیت سے اردو شاعری کے اس حصے میں بھی نمایاں نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے قدیم اور معاصر مذاہب کے زیر اثر تشکیل پانے والے معاشرے کے ساتھ اسلامی معاشرتی اقدا کے مخلوط ہوجانے کے سبب ان خالصتاً مذہبی اصناف کے مافیہ میں بھی ثقافت کے نقطۂ نظر سے اسلام سے بہت بُعد پیدا ہو گیا۔ مثلاً مرثیوں میں رخصت اور شہادت کے وقت جو مناظر جذبات نگاری کے عنوان سے نظم ہوئے ہیں وہ ہندی خواتین کے سے بین و بکا، طعنوں اور کوسنوں کا نقشہ تو واقعی پیش کرتے ہیں لیکن قرنِ اوّل کی ان عظیم مسلم خواتین کی جلالت و وقار، تحمل و تمکین اور عزم و شوقِ جہاد سے ان کو دور سے واسطہ بھی نہیں۔ خواہ اسے گریہ آفرینی کے مقدس مقصد کے حصول کی غرض سے مقامی رنگ کی آمیزش کہہ کر اس کیلئے جواز کیوں نہ تلاش کیا جائے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ قرنِ اوّل کے عظیم مسلمانوں (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے معاشرے کی عظمت کی کوئی تصویر اور برتری کا کوئی نقش اس شعری سرمائے میں بھی نہیں ابھرتا۔

حالی، شبلی، اکبر اور دوسرے شعراء کی بہت سی نظمیں ہماری ملی شاعری میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن ان کا موضوع چونکہ اسلام اور اہلِ اسلام کی زبوں حالی ہے۔ اس لیے ان کو اسلامی ثقافت سے تضاد کی نسبت حاصل ہے کہ بجائے اسلام کے تفوق اور برتری کے ان نظموں سے اہلِ اسلام کی ذلت اور خواری کا نقش ابھرتا ہے۔ جس سے خود اسلام کی عظمت میں کلام کا پہلو اور شک کی گنجائش نکلتی ہے۔ اس طرح اگر تاریخ کو منظوم کر کے خدمت اسلام کی جائے تو مقصود چونکہ شاعری کی بجائے تاریخ نگاری ہوگا اسلئے ایسی تمام کوششیں بھی ہمارے مقصد کے لئے مفید نہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ اسے آثار قدیمہ سے دلچسپی اور قدامت شناسی کہتا ہے۔

اسی طرح چند واقعی نہایت اعلیٰ درجے کی نعتوں کو چھوڑ کر نعتیہ شاعری کے بیشتر حصے میں زیارتِ مدینہ کا شوق اس وقت محض ایک بے روح رٹ معلوم ہونے لگتا ہے جب رسول اللہ ﷺ کے مبارک سراپا کا ذکر اسی انداز میں کیا جاتا ہے جو غزل میں محبوب کے چشم و ابرو، اور عارض و گیسو کیلئے معروف و متداول ہے۔ مثلاً آنکھوں سے پلانے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شوقِ دیدار کا اظہار کچھ یوں ہوتا ہے کہ میر صاحب کے شوقِ "رخِ نکو" میں اور اس میں زیادہ فاصلہ نہیں رہ جاتا۔ آپ ﷺ کو ساقی اسی طرح کہا جاتا ہے جیسے (مثلاً) غزل میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یادش بخیر پیرِ مغاں کا ذکر ہو۔ یہ سب کچھ ہمارے خیال میں زبانی گستاخی اور شقاوت کا مظاہرہ ہے۔ یوں اس کا نعتِ رسول ﷺ سے کیا تعلق ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ساری شاعری میں بشمول صوفیانہ شاعری کے اسالیب بیان اور استعاراتی تشکیلات کے پس منظر کے اعتبار سے محلِ حوالہ کے طور پر جس تہذیب کے جو نقوش ابھرتے ہیں وہ خالصتاً عجمی و مجوسی تہذیب ہے۔ ساقی، شراب، پیر مغاں، مُغ بچے، غلام، دیر کنشت، جام، مینا، خُم، وغیرہ کو، کہ جن کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے، اسلامی تہذیب کے عظمت و شوکت اور تفوق و برتری کے نقوش کیسے کہا جاسکتا ہے۔ طرفہ یہ کہ بالآخر "حیلۂ صوفیانہ" سے کام لے کر ان سب استعارات کو ان کے مالہٗ و ماعلیہ سمیت کچھ یوں مشرف باسلام کیا گیا کہ شراب سے مراد شرابِ معرفت ہے، مستی سے مراد عرفان ہے، ساقی سے مراد خود ذاتِ باری ہے۔ پیرِ مغاں سے مراد ہادیٔ و مرشد ہے وغیرہ۔ گویا ان مجازات کے مصداق بدل دیئے گئے لیکن مروجہ مجازات میں تبدیلی گوارا نہ کی گئی۔ بلکہ بادہ و ساغر کہے بغیر بات نہ بننے کا اعتراف کر کے اپنے حسابوں جنت اور اسلام کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے۔ یہ عذر گناہ بد تراز گناہ ہے۔

اردو شاعری کی ابتدا سے بیسویں صدی کے اوائل تک ہمیں کوئی ایک شاعر بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی شاعری میں اسلامی ثقافت کی بھرپور نمائندگی ملتی ہو۔ البتہ رباعیات و قطعات کی شکل میں ایک نہایت مختصر حصہ اردو شاعری کا ایسا ہے جس میں جزوی طور پر اسلامی ثقافت کے آثار اس حد تک ملتے ہیں کہ انہیں اسلامی ضابطۂ اخلاق سے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ لیکن استعاراتی تشکیلات کا معاملہ یہاں بھی وہی ہے۔

اسلامی طرز حیات اور اسلامی ثقافت کی بھرپور تصویر ہمیں صرف اقبال کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس کے ہاں بھی شراب و شیشہ اور ساقی و خم خانہ وغیرہ قسم کے الفاظ قابلِ لحاظ حد تک کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بات اس لئے ہمارے مقصد کے منافی نہیں کہ ان لفظوں کے ساتھ وابستہ عجمی روایت کو اس کی شاعری کے فکری باطن میں برتری اور تفوق کی نسبت ہرگز حاصل نہیں۔ وہ ان الفاظ کو استعمال کرنے کے باوجود ماضی کے شعراء کے ساتھ "ہم زبانی" کا رشتہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اسلامی ثقافت کے امین مسلم مفکرین اور ادبا کے ساتھ ہمدلی کا رشتہ رکھتا ہے اور بقول مولانا رومی

ہمدلی از ہم زبانی بہتر است

وہ یہ کہہ کر کہ

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الا
لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

الفاظ کے استعمال کے سلسلہ میں اپنا موقف ظاہر کرتا ہے۔ اور ان تمام الفاظ کے پیچھے معانی کی روح کے طور پر قلبِ مومن کے ایقان کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اور جب اس کے بغیر لاالٰہ الا بھی اس کے نزدیک "لغتِ غریب" ہے تو عجمی روایت کے امین الفاظ و استعارات کس گنتی و شمار میں ہیں۔ وہ کہتا ہے

کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ الفاظ و استعارات کو برتنے کے سلسلے میں ان کی دلکشائی کا قائل ہے وہ الفاظ کو صدف اور جس نظریئے کی آب و تاب ظاہر کرنے کے لئے وہ الفاظ استعمال ہوں اُسے گوہر قرار دیتا ہے۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گوہر سے

یوں وہ ان الفاظ کو استعمال کرنے کے باوجود ان کے معنوی باطن پر نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ عجمی روایت کے نظام علامات اور استعاراتی تشکیلات کے تمثال خانے کے مقابلے میں اس نے خالصتاً عظیم اسلامی تہذیب کے درخشاں نقوش و آثار سے اپنے علائم اور استعارے اخذ کئے۔ یہ بات بظاہر کسی ایک آدمی کے بس کی معلوم نہیں ہوتی کہ وہ اسالیب بیان کی صدیوں پر محیط پوری روایت کو ناقابلِ اعتنا قرار دیکر صرف چند سالوں میں اپنی استعاراتی تشکیلات کے لئے تصوراتی پیکروں کا ایک ایسا متبادل نگار خانہ فراہم کرے جو جلیل تر اور جمیل تر ہو۔ لیکن اقبال کے ہاتھوں یہ انہونی ہو گئی۔ دنیا بھر کی تمام زبانوں کے جملہ ادبی سرمائے میں یہ واقعہ اس سے پہلے نہ ہوا تھا کہ تنہا کسی ایک فنکار نے صدیوں سے مروج روایت کے متوازی ایک عظیم تر روایت کی نہ صرف بنیاد رکھی ہو بلکہ اُسے اس طرح مستحکم بھی کر دیا ہو۔ اور کسی قوم کی تاریخی عظمت و شوکت کے نقوش سے مزین ایک نیا تمثال خانہ دریافت کر کے پہلی روایت کے طلسم کو توڑ دیا ہو۔

اسلامی تہذیب کے زریں دور کی عظمت، برتری، تفوق، غلبہ اور کامیابی کے آثار یعنی اسلامی ثقافت کی نمائندگی کا مظہر دیکھنے کے لئے اقبال کے کلام پر سرسری نظر بھی ڈالئے تو آپ محسوس کریں گے کہ اسے عدالت نوشیروانی سے عدالتِ فاروقی کا ذکر زیادہ مرغوب ہے۔ وہ فقر بوذر اور صدق سلیمان کا ذکر کرتا ہے۔ اسے جام جمشید سے زیادہ طارق بن زیاد کی کشتیوں اور عقبہ بن نافع کے گھوڑے کے ذکر سے دلچسپی ہے۔ وہ بدر و حنین کا ذکر کرتا ہے۔ وہ دلِ مصطفےٰ ﷺ اور دمِ جبرائیل کی گرمی محسوس کرتا ہے۔ اسے دلقِ اویس اور چادرِ زہرا، نانِ جویں، اور بازوئے حیدر، سوز و سازِ رومی اور پیچ و تاب رازی اور صحرائے عرب کے شتربانوں کا تذکرہ پسند ہے۔ یہاں تک کہ بھیڑ بکریاں چرانے، جسے ہم کوئی بڑا کام نہیں سمجھتے اقبال اسے نہایت اہم معاشرتی قدر قرار دیتے ہوئے انبیاء کی تربیت میں اس پیشہ کا مقام یہ کہہ کر واضح کرتا ہے کہ

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

ناقہ و محمل، حُدی و ساربان، خلیل و نمرود، محمود و ایاز، غرض اسلام کی عظمت و شوکت کے بے شمار اشارے اقبال کے کلام میں ہر جگہ یوں بکھرے نظر آتے ہیں کہ واقعی قومِ رسولِ ہاشمی کا ترکیب میں خاص ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس تمام اشارات و علائم کی فہرست بنانا مقصود نہیں، صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبال وہ واحد شاعر ہے جس کے کلام کو ثقافت اسلامی کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com